لہو رنگ صحیفہ
کہکشاں تبسم

لہورنگ صحیفہ

کتاب کا نام : لہورنگ صحیفہ (شعری مجموعہ)

شاعرہ : کہکشاں تبسّم

صفحات : ۱۷۶

موبائل نمبر : +918651449489

ای میل : kahkashantabassum26@gmail.com

سنہ اشاعت : ۲۰۲۰ء

کمپوزنگ : زارا آفرین

قیمت : ۲۵۰ روپے

مطبع : تاج آفسٹ پریس، دریاپور، پٹنہ۔ ۴

رابطہ

Kahkashan Tabassum
C/O - Md.Zayaulislam Rizvi,
Department of Urdu,Sabour College,
Sabour,Bhagalpur-813210

ناشر

کسوٹی پبلی کیشن

صدر بازار، سمستی پور۔ ۸۴۸۱۰۱

بہار (انڈیا)

اپنے زخموں کا لہو رنگ صحیفہ دیں گے
شہرِ گریہ کے مکیں اور کیا تحفہ دیں گے

کہکشاں تبسم

انتساب

نئی نسل کی شریانوں میں

بہتے

شعلوں کی انقلابی لپک

کے

نام

فہرست

کہکشاں تبسم لہورنگ صحیفہ

●●

موسمِ وہم وگماں

کہکشاں تبسم

گلوب ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا اک جال اور اس میں مقید زندگی جبر سے آزادی کا اندھا خواب آنکھوں میں بھرے کسمساتی چھٹپٹاتی ہوئی ــــــ بھلے ہی خطوں اور ملکوں کے نام الگ الگ ہوں مگران کے حصار میں کہیں ڈولتی رینگتی پر چھائیاں اپنی بقا کے لیے برسرِ پیکار اور کہیں لکیریں ہی آپسی محاذ آرائیوں میں گم۔ انسانی رشتے رابطے تہذیب اور ثقافت زہر آلود غبار اوڑھے عالمِ نزع میں الٹی سانسیں بھر رہے ہوں تو قلم کار کیا کرے کہ جیسے لفظ بھی اپنا معنوی سراپا تراشا بھول بیٹھے ہیں۔ آئین، دستور، قانون اور انصاف ریت کے ٹیلوں کی مانند بھر بھرا کر ڈھ چکے ہیں۔ بے حاصلی نے کیسی بے حسی بھر دی ہے کہ انگلیاں ہی نہیں نوکِ قلم بھی منجمد اور قلم کار دم بخود۔ فکر کے شرر چمکتے ہیں شعلہ نہیں بن پاتے کہ برف پگھلے اور زندگی آبشار کی طرح اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ چھک اٹھے۔ کہ نہ کہیں سانسیں بارودی کہرے کا جبر جھیلیں اور نہ ہی لہو کی موجیں بستیاں بہالے جائیں۔ پل پل بدلتے منظر نامے میں کوئی خیال کوئی فکر اپنے توانا قامت کے ساتھ ٹھہر ہی نہیں پاتا۔ دھچکوں اور سانحوں کی یلغار میں خوابوں اور امیدوں کے پیکر بھلا کب سلامت رہ پاتے ہیں !!

نسلِ انساں کی سلامتی اور تحفظ کا سبق نہ دو عظیم جنگیں دے پائیں اور نہ تقسیمِ ملک سے لے کر عصرِ موجود تک متواتر ہونے والے فسادات۔ اب تو فنا کے رنت نئے بہروپ سے سامنا ہے۔ این کاؤنٹر اور لنچنگ، بچیوں اور عورتوں کے ساتھ جاری ستم، جنسی زیادتی، ایسڈ اٹیک، گینگ ریپ، آتش زدگی اور پھر قتل ــــــ تشدد کی مکروہ روایت کی لگاتار توسیع ہو رہی ہے۔

استحصال کی زد میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ خلا، چاند، ستارے، ندی پہاڑ جنگل، چرند، پرند اور ہوا پانی بھی آچکے ہیں۔ محافظوں کی حمایتی چُپ نے سوالوں کے جنگل کھڑے کر دیے ہیں۔

مگر ـــــ سوال کرے کون......؟ بخششوں اور خلعتوں سے سرفرازی سب کا نصب العین ہے۔ زندگی روبوٹ کی مانند ہو جائے تو سوالوں کے محاذ پر لاشوں کو کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ یہ لاشیں تاریخ و تہذیب کی بھی ہیں اور مساوات و محبّت کی بھی۔ ہم وقت کے کس موڑ پر آ گئے کہ زندہ وجود کی شناخت ہی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ عدم برداشت کی یہ کون سی منزل ہے کہ صدیوں پرانے رشتے کاغذی آئینوں میں یک بہ یک اجنبی قرار پائیں؟ وسوسوں اور اندیشوں کے گہراتے اندھیرے میں کیا محبّت کے راگ ممکن ہیں؟

شعر و ادب اپنے عصری ماحول کی تاریخی اور تہذیبی دستاویز ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کسی ایک ملک کے نہیں بلکہ گلوبل معاشرے کے نشیب و فراز اس میں سمٹ آتے ہیں۔ یہ قلم کار کے وجدان اور فکری شعور پر منحصر ہے کہ تیز رفتار تبدیلیوں کے درمیان کس طرح اپنے اظہاریے کی بنت تیار کرے۔ زندگی میں ہر پل ساتھ چلنے والی ٹکنالوجی کے سبب نئی لفظیات کا استعمال ہونا ناگزیر ہے اور ان کے سہارے نئی علامات اور تلازمات گڑھنے کا عمل تازگی کا سبب بھی۔ کچھ عرصہ قبل تک کائنات کے جن فطری مظاہر کی دھنک رنگی شعری جمال کا اہم حصّہ تھی آج وہ ماحولیاتی المیے کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔ نظموں کا کینوس عصری منظر نامہ کو موضوعاتی وسعت اور اسلوبیاتی تنوّع کے ساتھ پیش کرنے میں معاون ہے۔

نظموں اور غزلوں پر مشتمل **"لہو رنگ صحیفہ"** میرے اندیشوں اور اضطراب کے لمحوں کا زائیدہ ہے کہ شہرِ گریہ کے مکینوں کے پاس کہنے کے لیے اور ہے بھی کیا !!

●●

خدا

خدا

اک نظم لافانی

سنی اور اَن سنی

اور اجنبی ساری زبانوں میں

بیاضِ وقت پر

صدیوں سے بس تحریر ہوتا آرہا ہے ـــــ!

●●

تم کہاں ہو؟

جب اونچی اونچی لہروں کے پھاوڑے
کناروں کو توڑتے
ساحلوں کو روندتے
بستیوں میں قبرستان کھود رہے تھے
تم وہاں نہیں تھے
جب گرتی دیواروں
اور اُڑتے چھپّروں کے ساتھ بہتے
ڈھور ڈنگروں کے جھنڈ
بے سمت لہروں کی آغوش میں سما رہے تھے
تب تم وہاں نہیں تھے
جب بہانہ بازوں کا ہجوم
انگلیوں کو خون میں ڈبو کر
مونچھوں پر تاؤ دیتے ٹھٹھا لگا رہا تھا

تب بھی تم وہاں نہیں تھے
جب بدنظمی نے اپنے پھیپھڑوں میں
معصوموں کے حصے کا آکسیجن بھر لیا تھا
اور بلکتے چیختے آنسوؤں کے پاؤں
کفن خریدنے کی فکر میں ہلکان ہو رہے تھے
تم وہاں بھی تو نہیں تھے
اب اتنا بتا دو
کہ زمان و مکاں کی حد میں بھی
اور اس سے پرے بھی
تم کہاں ہو اور کہاں نہیں !!

●●

کوئی نظم لکھو

کوئی نظم لکھو
زمیں کی گھٹن پر
جو نادان بچوں کے مسکان سی ہو
جو بوجھل ہواؤں میں مستی کا معصوم سنگیت بھر کے
صبا کو سبک رو بنا دے
دلوں میں امنگیں
رگوں میں ترنگیں جگا دے
کوئی نظم چڑیوں کی منقار جیسی
گلابی افق پر
ابھرتے ہوئے
سرخ سیندوری سورج کی کرنوں سے تخلیق کر دے
انوکھا کوئی گیت مدھم سروں میں
کوئی نظم ساون کے بوچھار جیسی

جو گردِ کدورت دلوں سے بہا دے
چمکتے ہوئے
سبز پتوں پہ اٹھلاتی تتلی کے رنگیں پروں کو
بسنتی رتوں کی عبارت بنا دے
نئے پھول کھلنے کا مژدہ سنا دے
فسردہ فضاؤں میں تانیں اڑاتی ہوئی بانسری سی
کوئی نظم لکھو
جو خوابوں کو تابوتی لمحوں کی یورش سے محفوظ رکھے
جو مردہ بصارت، سماعت میں بھر دے حرارت
غنودہ جسارت میں شدت کی حدت جگائے
بہت حبس طاری ہے جاناں!
کوئی نظم لکھو......!

●●

ہم کہاں آ گئے

زندگی ـــــ
موجِ دریا سے لڑتی ہوئی
اجنبی ساحلوں کے کلیجے سے لپٹی
گدیلے پہ نم ریت کے
سوگئی ـــــ!
موت ـــــ نیل وفرات اور دجلہ
موت ـــــ جہلم اور گنگا ہے کوسی اور جمنا
موت ـــــ سر کی ردا
موت ـــــ اسکول کا راستہ
موت ـــــ شادی کی محفل
عبادت کی صف اور دعاؤں کی مجلس
اجنبی شہر یا اجنبی بستیاں ہوں
پہاڑوں کے خطے ہوں یا وادیاں ہوں
سارے یک رنگ ہیں

موت چھپ چھپ کے گلیوں میں کھیلے
چڑھے اونچی چھت پر پتنگیں اڑائے
ماں کی آغوش سے زندگی کھینچ کر
نوکِ نیزہ پہ جھولے جھلائے
موت ـــــ کچّے پکّے نوالوں میں سمٹی
گھونٹ زہریلے پانی کا بھرتی
ننھے حلقوم سے پار ہوتی رہی
موت کا ذائقہ چار سو رقص کرتا
رگوں میں پسرتا، فلک سے برستا
کلسٹر کی صورت
کہ اڑتی ہوئی تتلیاں ہوں
موت تو امن کی فاختہ کے پروں سے بندھی
سر پہ منڈراتی غوطے لگاتی
زمیں زاد منصف کے مکروریا میں گندھے
سب اصولوں پہ ہنستی اڑی جارہی ہے
شہر بنتے کھنڈر
بڑھتی قبروں کی آبادیاں
ہم کہاں آگئے......!!

●●

ابنِ زیادی نوشتہ

اقتداری نشہ
روز ہنکار بھرتا ہوا
نت نیا اک شگوفہ کھلاتا ہوا
روز کوئی نہ کوئی تماشا دکھاتا ہوا
اپنی قوت کے اصرار پر ہے مصر
لوگ سہمے ہوئے
وسوسوں دہشتوں سے لرزتے ہوئے
اپنے گوشوں میں خاموش ہیں
جب کہ اقرار کرنے پہ خلعت کا وعدہ
کھلے عام ہے
منکروں کے لیے
ہے سزا قید کی

یا کہ رستوں پہ چھوڑی گئی موت کی
پھر سے درپیش ہے اک نئی کربلا
حکم نامہ نیا تو نہیں
یہ ہے ابنِ زیاد کی نوشتہ وہی
گزری صدیوں کے کھنڈرات سے
جو نکل آیا ہے!!

●●

معذرت

وہ
دوسرے پلینٹ سے آتے ہیں
چشم دید بھی
ان کی شناخت نہیں کر سکتے
پنسل
اسکیچ بنانے سے قاصر ہے
ان کے چہرے
انسانوں جیسے ہیں
نہ حیوانوں جیسے
وہ
شیطانی چہروں والے ہیں
اور شیطانوں پر
جرم عائد نہیں ہوتا

دوسرے پلینیٹ والوں پر
دھرتی کا قانون نافذ نہیں ہوتا
جو کچھ ہو رہا ہے
وہ رک نہیں سکتا
سوالیہ لاشو ـــــ!
قانون کے ہاتھ معذور ہیں ـــــ!!

●●

کبھی پڑھنا

کبھی پڑھنا
درودیوار پہ لکھی ہوئی تحریر سے آگے
کسی چہرے پہ اوراقِ پریشاں کی طرح
افسردہ آنکھوں کو
کسی رخسار پر ٹھہرا ہوا آنسو سمندر بھر
کبھی پڑھنا
جو زورِ موج سطحِ آب پر تحریر کرتا ہے
ہوا کا خامہ لکھتا ہے جو نوحہ جلتی دھرتی پر
کبھی پڑھنا
لبوں سے مسکراہٹ، قہقہے جب الوداع کہہ دیں
تو لمحہ ہجر کا برفیلے پتھر میں بدلتا کس طرح سے ہے
کبھی بارش کی گرتی بوند کو پڑھنا
کہ امرت دھار کیسے موت بنتی ہے

کبھی پڑھنا تو بوڑھی ہڈیوں پر کھال کی سلوٹ
سویرے چائے کی پیالی سے اٹھتے بھاپ میں
تنہائی کے دوہے
اُسارے طاقچے پر مکڑیوں کے جال کے پیچھے
دھری عینک کی ویرانی
کہیں آنگن کے اک کونے میں بکھرے
مٹھی بھر دانے
کٹوری میں بھرا پانی
کسی چڑیا کی آمد کا سراپا منتظر
ترستی شاہراہیں چھاؤں کی خاطر
جواں مضبوط شانوں پر دھرے ننھے جنازے
کسی عورت کی چھاتی میں چھلکتی دودھ کی نہریں
کہیں سوکھے گدیلوں پر جو لکھا مرثیہ ہے
پڑھا تم نے؟
نہیں نا ــــ!
تمہاری بانجھ آنکھیں کب سے ہیں گروی پڑی
سوداگروں کے خواب کھاتوں میں ــــ!!
کبھی پڑھنا ــــ!!

●●

مٹّی کا نوحہ

ہزاروں سال کی خوش منظری
غمزہ سرائی
صبا کا پیرہن پہنے
دھنک رنگوں کی پھلکاری رِدا اوڑھے
نہائی مولسری اور موگرا
بیلا، چمیلی اور چمپا کی
نشیلی خوشبوؤں میں
گھنے برگد کی
وجدانی فسوں خیزی کو رگ رگ میں بسائے
جبیں پر چَندَنی بندیا لگائے
تھرکتے پاؤں میں جھانجھن محبت کی سجائے، جو
مگن تھی رقصِ طاؤسی میں مدت سے!
یہ منظر کس طرح بدلا؟

کمانِ لب سے چھوٹے جا رہے ہیں
تیر زہریلے
بہانہ باز ہر جا گھات میں ہیں
نگاہیں جن کی عقابی
لپکتے ہیں
شکاری تیندوؤں جیسے
لہو سیلاب میں غرقاب سانسیں ہوتی جاتی ہیں
اندھیرا اژدہا صورت
نگلتا جا رہا ہے
روشنی اور رنگ سارے منظروں کے
مری وادی میں جانے کب
اُگے گا وہ نیا سورج
کہ پھر مٹی یہ میری
دھنک پشواز پہنے
رقص میں ہوگی ـــــ!

●●

رزمِ گاہِ فنا

بریدہ سر اور بدن دریدہ
ہزاروں قصے
ہجوم صورت پکارتے ہیں
مجھے سناؤ...... مجھے سناؤ
مقامِ حیرت پہ ایستادہ ہے شہرزاد
اور سوچتی ہے
نہ جِن ہے کوئی
نہ ساحرہ نہ کوئی پری ہے
تو کس نے قالب بدل دیے ہیں؟
چرند سارے
پرند سارے درند سارے
بہ شکلِ انساں
لہو کی چھاگل سے گھونٹ بھرتے
زمیں پہ لاشے بچھا رہے ہیں

نہ مردوزن کا شمار ہے کچھ
دہک رہا شعلہ زار ہے کچھ
نہ شہریارِ صدی کوئی ہے
اگر کہیں ہے
تو شاید اس کی سماعتیں بھی
بصارتیں بھی جسارتیں بھی
صدائے گریہ
ہجومِ غوغا کو سن کے مفلوج ہو چکی ہیں
بدن دریدہ یہ داستانیں
بریدہ سر یہ کہانیاں سب
سیاہ دن کی یہ وارداتیں
دریدہ شب کے ہزاروں قصے
کسے سنائے؟
تو شہرزاد اب کھڑی ہے گم سم
لرزتے نوکِ مژہ پہ قطرے
چمک چمک کے یہ کہہ رہے ہیں
کہ دیدنی جو حکایتیں ہیں
وہ سب کی سب ان سنی رہیں گی ــــــ!!

●●

اندیشہ

یہ جو بچّے ہیں نادان ہیں
اور انجان ہیں
انہیں کیا خبر وقت کے موسموں کی
عنان اب رُتوں کی
تو قبضے میں ابلیس کے آگئی ہے
وہ چاہے تو آندھی چلائے
کہ بادل بھی اس کے اشاروں پہ ہیں رقص کرتے
وہ چاہے تو دھرتی پہ سورج کو قالین جیسا بچھادے
وہ چاہے تو ہر سبز خطے کو صحرا بنادے
فلک بوس اونچے پہاڑوں کو مومی بنا کر گھلادے
سمندر کا پانی اڑا کر سکھادے
وہاں زرد شعلوں کی موجیں بہادے
ہوا اس کی مرضی کے تابع

مگر یہ جو بچّے ہیں

نادان ہیں، بھولے، انجان ہیں

انہیں یہ پتا ہی نہیں ہے

کہ صحنوں میں بارش کا گدلاتا پانی

بدل جائے گا موجِ خوں میں کسی دن

طلسمی ہوا موت کا جشن برپا کرے گی

نہ پھر چہچہے ہوں گے، نہ قہقہے

نہ معصوم شوخی نہ ادھم، شرارت

احاطہ نہ آنگن نہ محراب و گنبد

لہو کے سمندر میں پھر

ننھے ہاتھوں بنائی ہوئی

ڈوب جائیں گی کاغذ کی سب کشتیاں ـــــ!!

●●

خانہ بدوشی

اجڑنا اور بسنا پھر اجڑنا
یہی مقسوم ہے شاید
کبھی بغداد غرناطہ
فلسطیں قرطبہ یا شام کوسووو
کبھی برما
ہم اپنے شانو پہ خیمہ اٹھائے
گزرتی جاتی صدیوں سے
مسلسل اک سفر میں ہیں
زمیں ماں ہے ـــــ مگر
کبھی بازو پکڑ کے
کبھی آغوش میں بھر کے
ہمیں آشوبی لمحوں سے بچاتی ہی نہیں
گئی صدیوں سے ہم ماں سی زمینیں ڈھونڈتے ہیں

کہیں بستی بسا بھی لیں
تو پامالی دبے پاؤں ہمارے ساتھ چلتی ہے
بدلتے ہی ذرا رُت
وہ کیا طوفاں اٹھاتی ہے
ہماری بے سروسامانی اوراقِ پریشاں کی طرح
کسی ناگن سی لہراتی نکلتی ہے
زبانیں لپلپاتی ہیں
پرانی دہشتوں کی کہنہ ممیوں میں
اچانک جان پڑتی ہے
فنا کے رقص میں گم دو کمانیں پھر
ہماری سمت بڑھتی ہیں
ہمیں تاریخ آخر کب تلک ڈستی رہے گی ــــــ!!

●●

چراغِ جاں

عجب سی نیند ہے
گہری بہت گہری
سب اعضا شل پڑے ہیں
کہ آنکھیں ہی نہیں
سوچوں کے سارے در بھی خفتہ ہیں
دریچہ خواب کا جیسے مقفل ہے
یہ کیسی نیند ہے
کہ اپنے ہونے کے کسی احساس کی حدت نہیں ملتی
شرارہ سا کہیں کچھ جھلملاتا ہے
چراغِ جاں نہیں بنتا
جو گہری دھند کو چیرے
کڑے جادو کو توڑے
کہ اپنے نو شگفتہ پھولوں کی خاطر
ہمیں تو جاگنا بھی ہے ــــ!!

●●

رقصِ شرر

سوادِ جاں میں خوابیدہ
ہزاروں آرزوؤں
خواہشوں کے ان گنت پیکر
ہیں جن کے عکس نادیدہ
کوئی دن سے یہ سب کچھ میگما صورت
کہیں اندر پگھلتا ہے
بھنور سا گھومتا
چکّر لگاتا مضطرب باہر نکلنے کو
غضب کی چھٹپٹاہٹ ہے
کہ شدّت روپ بھر لیتی ہے حدّت کا
زمینِ دل کو ہے شعلہ نفس کرتا
بہت گہرائی میں رقصِ شرر جاری
کوئی رستہ بنانے کے جنوں میں گم

اک اسطوری قصہ

سینت سنبھال کے رکھ لی ہم نے
اپنے حصے کی کچھ چیزیں
صندوقچی میں نظر بچا کر
صدیوں بعد جب رواں زمانہ
عہدِ عتیق میں ڈھل جائے گا
اور کسی ٹیلے کے نیچے
شہر ہمارا دب جائے گا
تب کچھ ہاتھ تجسس تھامے
ٹیلا کھودنے آئیں گے
دبی وہیں پر انہیں ملے گی
میری پرانی صندوقچی
جس کے اندر دھرا ملے گا
بادل کا رومالی ٹکڑا
اور ٹوپی بھر دھوپ

اک بٹوا بھر چاند کی کرنیں
اور مٹھی بھر جگنو
مرتبان میں شوخ ہوائیں
اور ہتھیلی بھر سبزہ
لفظ بھر امّاں کا گلک
اک تسبیح میں گندھی دعائیں
حیرت کا سنسار ملے گا
کسے خبر ہے
تب تک جاناں !
یہ سب چیزیں
میوزیم کے اک گوشے میں
سجا ہوا تاریخی ورثہ
یا اسطوری قصہ ٹھہریں ــــ!!

●●

دکھ تو ساجھے

سب کے اپنے خواب ہیں جاناں!
سب کے اپنے قصے
نفرت، پیار، ہوس اور دھوکا
سب کی الگ کہانی
ڈگر سے ہٹ کر کچھ افسانے
الگ الگ رنگوں میں سجے ہیں
کھٹے میٹھے، تیکھے کڑوے
ترش، کسیلے
جانے کتنے ڈھیر تجربے
سب کے اندر اپنی دنیا
دھرتی اور آکاش
اپنے چاند، ستارے، سورج
دریا، جھرنے، تال

سب کے اندر گہرا گہرا

اندھیارا پاتال

اپنی اپنی آندھی پُروا

اپنی الگ پھوار

مدھ ماتے موسم میں چلتی پریم کی مند بیار

جگنو، تتلی، جھینگر جیسے اپنے کیٹ پتنگ

کوئل، مور، کبوتر جیسے پنچھی اور بہار

دکھ کی لہریں اک جیسی ہیں

درد کی ٹیسیں اک جیسی ہیں

اور آنسو یک رنگ۔۔۔۔!!

●●

بانسری والا

تمام تر یہ طلسم تیرا
تمام تیری فسوں طرازی
کمال تیری یہ نَے نوازی
سُروں پہ جس کی نثار ہو کر
تمام خلقت نکل پڑی تھی
دھنک کے رستے
نئے افق آشیانہ کرنے
مگر مسافت کے درمیاں ہی
نہ جانے یہ لَے بدل گئی کیوں؟
نہ جانے کیسے
مدھر سُروں میں
گرجتی تانیں لپکتی آئیں
گلے ملیں، اور

لگا بدلنے سمے کا منظر

سرکتے مدہوش و مخمور سایوں کی چال بدلی

ٹھٹھک کے تھمنے لگے ہیں پاؤں

تو سن مرے نئے نواز ساحر

نشے میں بوجھل یہ ساری آنکھیں

یہ سارے چہرے

جو اصل حالت میں لوٹ آئیں

تو ساری تیری فسوں طرازی

طلسم سارا

بس اک چھناکے کی گونج بھر ہو......!!

●●

سکوت کے اس پار

فضا بارود سے بوجھل
ہراساں لوگ دونوں سمت
عجب سے وسوسے خدشے
اور اَن ہونی کا ڈر لرزاں
بدن جیسے کہ پتھرائے
ذہانت ایٹمی ہے
نہ جانے کیا ہو اَگلے پل
سڑک پر ایک مجمع
چپ کی چادر اوڑھے ساکت ہے
کریں ہجرت تو چھوٹیں کھیت اور کھلیان سب اپنے
کہاں لے جائیں گے خود کو......؟
سوالوں سے الجھتی زندگی ہے
اک تذبذب میں

وہیں اِس پار اور اُس پار کے مابین
اُگے پودوں کی صف پر
خوش نما ننھی سی اک تتلی
تلاشِ غنچہ و گل میں
دھنک سا پنکھ پھیلائے
تھرکتی اڑ رہی ہے
خوش بوؤں کے گھونٹ بھرنے کو......!!

●●

سوچنا پھر

درودیوار پر سبزے کی صورت
کان اُگ آئیں
تو جاناں!
سوچنا
سرگوشیاں بھی جرم ٹھہری ہیں
چنبیلی کے ہرے منڈوے پہ
جب شعلوں کی کلیاں سر اٹھا کے
آنکھ دکھلائیں
تو اتنا جان لینا
عشق اب معتوب ٹھہرا ہے
کہ اندھی مٹھیوں میں جب ترازو لڑکھڑائے
عدل اور انصاف
اندیشوں سے تھرّائے

تو جاناں !

سوچنا

سچائیاں مصلوب ہوں گی پھر

بدلتے موسموں میں

دھوپ، بارش اور ہوا پانی بھی

جب گرگٹ مزاجی پر اتر آئیں

تو باقی بچ رہا پھر کیا......؟

تو کیا دنیا ہماری اب

نمائش بھر ہے سرکس کی......؟

●●

خوش گمانی

فصیلِ شہر کے اندر
عقوبت گاہیں ہیں موجود
شاید بے حساب اور انگنت
کسی جانب فصیلوں میں شگافیں پڑ گئیں تو کیا
دریچے یا کہ روزن کُھل گئے تو کیا
وہاں گھٹتی ہوئی ہر سانس کو آزاد کہنا کیا
ابھی بھی
جبر کے ڈھیروں سیہ خانے سلامت ہیں
جہاں سورج نہیں جاتا
جہاں شبنم نہیں گرتی
جہاں سہمی ہوئی گونگی ہوائیں
بہری دیواروں پہ دستک دے نہیں پاتیں
جہاں بے آسماں

اور بے بدن پر چھائیاں بس رینگتی ہیں

سنو!

اے شور کرتے چہچہاتے

خوش گماں بھولے پرندو!

ابھی سارا قبیلہ

سامری کے چنگلوں میں چھٹپٹاتا ہے

ابھی یہ ہاؤ ہو کیسا

ابھی یہ جشن کیا معنی ——!

●●

دھند

عجب ریزہ خیالی ہے
نہ کوئی لفظ چہرے سے حجاب اپنے ہٹاتا ہے
نہ پردہ دھند کا منظر سے ہٹتا ہے
کہ آئینہ کوئی تو عکس کاڑھے
کھلے آکاش پر گاتے پرندوں کی
عجب ریزہ خیالی ہے
جہاں ہر لفظ
معنی کے پروں کو کھولنے سے بچ رہا ہے
گریزاں سا ہر اک لمحہ
اگر چاہوں
کوئی مصرع بناؤں
کوئی پیکر تراشوں
کوئی منظر سجاؤں

قلم کی نوک بھی رستہ بدلتی ہے
عجب سی بے کلی ہے
یا کہ شاید بے بسی ہے
کوئی تصویر بنتی ہی نہیں
نہ کوئی شعر ہوتا ہے
نہ کوئی نظم اپنی چھب دکھاتی ہے
نہ جانے کیسی سم خوردہ ہواؤں کا اثر ہے
میں گہری دھند میں گم ہو رہی ہوں ـــــ!

●●

ڈگڈگی کی طرح بجتے لفظ

جمہوریت ـــــ
قومیت ـــــ
مساوات ـــــ
لفظ ڈگڈگی کی طرح بجتے ہیں
تماشائی ہجوم
سحر سامری میں غنودہ
فلک نما خواب
تاریک سرنگوں میں
رسّی پر چلنے کا کرتب دکھاتے ہوئے
جیب تراشتے
طلسمی ہاتھ
نادیدہ کٹورے
لبالب

فضاؤں میں پرندوں کی قطاریں
ہجرتوں کے گیت
چیخ کی صورت گونجتے ہیں
اور گھر کی دہلیز پر بسورتا بچّہ
مزدور باپ کی باٹ جوہتا ہے
بھوکی خواہشوں کے ٹپکتے قطرے
میلی آستینوں میں جذب
اور
خزاں رتوں کی خشک ہواؤں میں
دریدہ درختوں پر
ننھی کونپلیں
نئے موسم کی
ہری آئتیں لکھ رہی ہیں !!

●●

چند ساعت ہی سہی

روشنی پیتے ہوئے
قطرۂ شبنم کو کبھی دیکھا ہے
جذب کرتے ہیں جو سورج کی نمو
چند ساعت ہی سہی
ان کا دھنک رنگ وجود
سبزہ و گل کے لیے
شاخِ ثمر ور کے لیے
کیسے بن جاتا ہے موجِ قلزم
کتنی آنکھیں ہیں جو ہر صبح انہیں دیکھتی ہیں
کب کسی روح میں اترا یہ رو پہلا منظر
سب کے سب کہرا قناطوں میں ہیں خوابیدہ پڑے
جاگ بھی جائیں تو کیا
رینگتے سایوں کی بیساکھیاں چاہت ہوں گی......!

●●

آؤ لکھتے ہیں

اس سے پہلے کہ لفظ مر جائیں
اس سے پہلے کہ حرمتِ خامہ
ہو پشیمان اپنی شوکت پر
اس سے پہلے کہ ہاتھ کٹ جائیں
اس سے پہلے کہ سازشیں کرتی
سر سے گزرے لہو کی طغیانی
چھین لے حرف وصوت کے پیکر
درمیاں جو بھی وقت باقی ہے
وہ غنیمت ہے
آؤ لکھتے ہیں
انگلیوں کو تراش کر اپنی
اس زمیں کے دریدہ سینے پر
کوئی اک لفظ جو محبت ہو ——!

●●

ذرا سی دیر ساحل پر

ابھی کچھ وقت ہے
کہ اس سے پہلے
زمینیں دلدلی ہو جائیں
سمندر ریت اگلیں
شفق ملبوس شامیں خون تھوکیں
شبوں کی جگمگاہٹ
بجھتے انگاروں میں ڈھل جائے
تم اپنا ہاتھ دو جاناں!
ذرا سی دیر ساحل پر
ہوائے نم کے جھونکوں میں
تمہارا ہاتھ تھامے رقص کرنا چاہتی ہوں ـــــ!

●●

سلگتا منظر

موت کے آہنی تھے شکنجے
جس میں کستے گئے
ان کے ہل بیل بھی
کھیت کھلیان بھی
خوش نما بالیاں
سبز فصلیں، کہ جو زرد پڑتی گئیں
نظرِ بد سے بچاتا ہوا
شوخ چڑیوں کو تنبیہ کرتا ہوا
کالا لمبا بجوکا بھی جانے کہاں گم ہوا
سوپ، تھاپی، چنگیرے سبھی
مَون سادھے ہوئے
بوریاں
دال، چاول اور گندم سے بھرنے کی امید میں

خالی بیٹھی رہیں
ڈھور ڈنگر چیختی چراگاہ میں
سوکھے پیڑوں کی بے برگ شاخیں ہوں جوں
بھوک سے خشک ڈھانچوں میں ڈھلتے گئے
کھردری انگلیاں
سونی آنکھوں میں سپنوں کا لاشہ دھرے
بند ہوتے مقدر کے در پر ٹنگی رہ گئیں
اور دکانیں سبھی شہر و قصبات کی
دھنک رنگ پردیسی دلکش لفافوں سے
سج دھج کے دلہن بنیں
بے بصر، بے خبر جیب و دستار پر حکمراں
اور وہیں ان کے نزدیک ہی
بس قدم دو قدم
روز ہوتا رہا موت کا تانڈو......!!

●●

کھیل جاری ہے

بساط دیکھو بچھی ہوئی ہے
سب اپنے مہروں سے چال چلتے
کسی کا ہاتھی
کسی کا گھوڑا
کسی کی کشتی
کسی کا پیادہ
یہ کھیل جاری ہے مدتوں سے
ہے فیل اندھا......چنگھاڑتا ہے
اپنگ گھوڑا......وہ ڈھائی گھر کو پھلانگے کیسے
ہے موجِ آبِ رواں پہ کشتی بھی ڈگمگاتی
پیادے سارے اپاہج ہیں
حسابِ سود و زیاں میں گم ہیں وزیر سارے
بصارتیں اور سماعتیں سب

بساط مرکز بنی ہوئی ہیں
عجب کھلاڑی یہ بازی گر ہیں
جو مٹھی بھر ہیں
نہ ہارتے ہیں نہ جیتتے ہیں
جو اونچے برگد کی چھاؤں تھامے
زمین کو
اک رزم گاہِ فنا بنانے کی کوششوں میں
جٹے ہوئے ہیں ......!!

●●

پسِ منظر

ابھی یہاں پر نازک سبزے
لپک جھپک کے
دھوپ کرن سے دامن بھرتے
گھاس کی ننھی نوک پہ ٹھہرے
نازک قطرے
رنگوں کی اک چھٹا بکھیرے
لرزیدہ ہیں
ہوا کی تھپکی شجر بدن میں سہرن بھرتی
کومل پتے وجد میں جیسے جھوم رہے ہیں
ساتوں سُر کی جھنکاروں کو
منقاروں میں بھرے پرندے
سوئی سماعت پر جیسے جادو کرتے
ست رنگا اک منظر جاناں!

آنکھوں آگے سنور رہا ہے
سپنوں کا سنسار سا جیسے
دور دور تک پسر رہا ہے
لیکن جاناں......!
اس منظر کے پار کہیں پر
لمحوں کی مٹھی میں دبی ہے اک انہونی
اس منظر میں دیکھ رہی ہوں
دستاروں کو
درباروں کی دہلیزوں پر
پڑے ہوئے پاپوش کی صورت!!

●●

اَن ہونی

زمیں کا سینہ بھی دھونکنی ہے
پہاڑ جیسے کہ بیدِ مجنوں
ستارے اشکِ مژہ کی صورت
خلا کے دامن میں گرنے والے
ہوا کے خیمے اکھڑنے والے
طنابیں سب کسمسا رہی ہیں شجر شجر کی
پیاسا سورج
سمندروں کو یوں گھونٹ بھر بھر کے پی رہا ہے
تہیں نچوڑے بنا وہ شاید نہیں رکے گا
نہ شور کوئی
نہ کوئی ماتم
یہ سب ہمارا کیا دھرا ہے
لبوں سے حرفِ دعا ندارد
زمین زادے اب اپنی کرنی کا پھل چکھیں گے!!

●●

پسِ دیوار

نوکِ سبزہ پہ کانپتی شبنم
سر چھپانے کی کوششوں میں ہوا
زرد پتوں میں کسمساتی ہوئی
جا بہ جا پنکھ فاختاؤں کے
رات کے سر پہ کیسری گھونگھٹ
اور بلی کوئی پسِ دیوار
بیٹھ کے اپنے ہونٹ چاٹتی ہے !!

●●

نوحہ کناں ہے شاعری

جب لفظوں کی بینائی
بارودی کنکروں کی بوچھار میں گم ہوگئی
استعارے قتل ہونے لگے
اور تشبیہیں مصلوب
تو شاعری عراقی اور یمنی ماؤں کی طرح
سینہ کوٹتی نوحے پڑھ رہی تھی
جب کہ اسے
فلسطینی عورتوں کی مانند
رجز پڑھنا چاہیے تھا ــــــ!!

●●

جمود

خامشی کی آہنی دیوار ٹوٹے
کوئی تو نعرۂ مستانہ کی سنگت پہ
کیفِ وجد میں آئے
قافلہ گزرے جنوں آثار کوئی
کس سے بے آہٹ سڑک یہ پوچھتی ہے؟
تمہارا شہر آخر کیوں
طلسمی خواب میں ڈوبا پڑا ہے !

●●

وقت

وقت

ریگِ ہست ونیست کو

مٹھی میں بھر بھر کے اڑاتا پھر رہا ہے

اور کہیں اک ننھا بالک

لبِ ساحل مگن ہے

ٹھنڈی بھیگی ریت پر

اک گھر بنانے توڑنے

اور پھر بنانے میں ـــــ!

●●

تاریخ کے سیاہ غار

ہم تاریخ کے سیاہ غار میں پڑے
موت جیسی گہری نیند کا جمود اوڑھے
کسی نادیدہ زمانے میں
شاید کبھی اصحابِ کہف کی طرح جاگے
تو ہمارے سکّے بھی کھوٹے ٹھہریں گے
اور بھاشا اجنبی
ملبے میں دب چکی بستیوں کی
بارودی دیواروں کے درمیاں
خون میں دھنسے
ہزار ہا انسانی پنجروں کے ڈھیر
اپنی شکستہ ہڈیوں کو قلم بنا کر
تاریخ کے اوراق پر آتنک کا باب لکھ چکے ہوں گے
اور نیند کے خمار سے بوجھل
ہماری روحیں
ابابیلی قصیدے پڑھ رہی ہوں گی!!

••

بلیک ہول کی جانب

جب گھوڑے چراگاہوں کی سمت بھیجے گئے
تو گھاس ناپید ہو چکی تھی
اور ندی ریت کا کفن اوڑھے ابدی نیند میں گم
غلام گردشوں میں رینگتی پرچھائیاں
سوکھی بیلوں کی طرح
پتھریلے ستونوں سے لپٹی بین کر رہی تھیں
اور دیواروں پر منقش آبنوسی فریم میں سجے
کاغذی شملے والے
اپنی اپنی نقرئی چھڑیاں تھامے
مارننگ واک کے لیے تیار
اور وقت بہروپ بھرتا
بلیک ہول کی جانب رواں !!

●●

بازار

گروی آنکھیں
کب بُن پاتیں خواب کوئی
رہن زبانیں
کب گاتی ہیں گیت
خاک اور آگ کے کھیل میں اکثر
جیون کے سارے الجھاوے
سارے دکھ سکھ
تابع ٹھہریں
گلوبل سودابازوں کے
تو اتنا جانو
اَن ہونی کا ہونی ہونا کیا مشکل ہے!

●●

نوشتۂ دیوار

جب صحیفے جزدانوں میں لپیٹ دئے جائیں
اور تیر تلوار نیزے شاملِ نصاب ٹھہریں
تو نسلیں
خندقیں اور میدانِ جنگ ہی تیار کریں گی
سو اب
زمین پر
سر بریدہ دھڑوں کا ہجوم
فنا کی تال پر بقا کے رقص میں ہے !

●●

ہوس

جب دریاؤں کے ہاتھ چھوٹے پڑ جائیں گے
تب شروع ہوگا رقص زلزلوں کا
سورج کا شانہ تھامنے کی کوشش میں
زمین اپنی پنسل ہِل پر پلٹ جائے گی
اس سے پہلے ہی
ہم نے زندگی کی کلکاریوں کے سارے جادوئی رنگ
آسمانوں زمینوں جنگلوں اور دریاؤں سے نوچ کر
حرص کے تابوتوں میں بھر دیے
اور قبریں پاٹ دیں
جب زیروزبر ازل سے ہی مقسوم ہے
تو پھر یہ ایٹمی دنگل؟

●●

زمینی خداؤ

تمہارے سر پہ ہی نہیں
زنبیلوں میں بھی تاج بھرے ہیں
سوداگری کے داؤ پیچ کے درمیاں
جسے چاہو عزت مآب بنا دو
جسے چاہو خلعتیں بخش دو
بارودی ذائقوں سے بھرے کیک بانٹنے والو
گلوب پر ہر پل من چاہے مان چتر بناتے رہو
ہوس کی فصلوں میں زندگی کی کھاد ڈالنے والو
زرخیز ریالی کنوؤں کے باوجود
تمہاری زبانیں
سینے پر کیوں لٹک آئیں ہیں؟

●●

بازی گری

جنگ ہمیشہ فیصلہ کن نہیں ہوتی
اُگتے اور ڈوبتے سورج کے درمیاں
کبھی کبھی کسی عیار لمحے میں
چھلتی مسکانوں کے بیچ
مٹھیوں میں داب کر
بلند کرتا ہے کوئی دودھیا پرچم
اور مکار ہتھیلیاں
مصلحت کی میز تھپتھپا کر
اندیشوں کو سلائے رکھنے کا ہنر دکھاتی ہیں!

●●

مفاد

صحیفے ابوجھ پہیلیاں نہیں تھے
کائنات کی ہر شئے تصرف میں دی گئی تھی
نائبینِ خدا کو
اور اس نے بازار سجا دیے
دریاؤں صحراؤں جنگلوں اور زمینوں کو
ٹانگ دیا نمائشی کھونٹیوں سے
بھر دیے چاند اور ستاروں سے شوکیس
اور ہوائیں جاروں میں
انسانی ہجوم
ریس سے نکل کے
خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے
نمائش گاہ کے باہر کھڑا ہانپتا ہے!

●●

بے حاصلی

سوکھی پسلیوں والے چرند
جب ہری زمینوں کی تلاش میں تھے
تب ہماری آنکھیں ریت پھانک رہی تھیں
من وسلویٰ اور ٹھنڈا میٹھا پانی
گئے دنوں کی تاریخ ہیں
خواب آنکھوں میں ڈولتے سیارچے
ضرورتیں اَنت ہین پاتالی گپھائیں
سب آشائیں صحرائی آنکھوں میں رستہ بھولیں
مجروح بینائی
پاؤں تلے بچھی زمین نذرِ شہر یار کر چکی تھی
اب پرچھائیاں خلائی رقص میں گم ہیں۔!

●●

گلوبل بے بسی

دکانیں سب سجی سنوری
بہت شفاف شیشوں کے دریچوں میں
نظر کی خیرگی اوڑھے
رکھی چیزیں توجہ کھینچتی ہیں
مجھے بھی چاہیے اپنے
بلکتے نونہالوں کے لیے
ذراسی آبشاری کھلکھلاہٹ
گلابی صبح کی کرنوں گندھی سی مسکراہٹ
مگر مطلوبہ شَے ملتی نہیں مولا!
مرے بٹوے میں سکّے سونے چاندی کے
کھنکتے ہیں
جو بازاروں کے خالی پن پہ ہنستے ہیں
عجب لاحاصلی کا سلسلہ ہے
بڑھتا جاتا ہے
کہ اب یہ بے بسی شاید گلوبل ہو چکی ہے!

●●

ایک نظم

اپنے حصے میں جو مٹھی بھر
دھوپ آئی ہے
اس کو غنیمت سمجھ
روح کی حدتوں میں سمو کر اسے
کپکپاتے ہوئے
سرد لمحوں کو
کچھ تو حرارت سے بھر
برف پگھلے نہ پگھلے مگر
سُن ہتھیلی میں کچھ جان آ جائے گی
بڑھ کے تیشہ اٹھانے تلک!!

●●

کوئی تیشہ اٹھاؤ

عجب سا حبس ہے
کوئی
اک پوٹلی تازہ ہوا کی لے کے آئے
یا کوئی خوشبو کا جھونکا
ایک مٹھی بھر
کہیں تو خواب کوئی
تازہ کونپل کی طرح پھوٹے
کہ آنکھیں زندہ ہونے کی گواہی دیں
کوئی بولے تو سبزہ بھر
یہ کیسا حبس پسرا ہے؟
ہوا فالج زدہ ہے کیا؟
کسی لہجے میں
بادل کی گرج سی کیوں نہیں ہے؟

کوئی تیور
چمکتا کیوں نہیں بجلی کی صورت؟
یہ یگ بھی پتھروں میں ڈھل چکا ہے کیا؟
نہیں ـــــ اب اور کتنی دیر جاناں!
کوئی تیشہ اٹھاؤ
سنگِ در توڑو
ہوائے سبز کو آنے کا رستہ دو ـــــ!

●●

سیاست

زندگانی کی ہتھیلی خوں بھری ہے
ربط کی ساری لکیریں مٹ چکی ہیں
وقت اک شاطر منجم کی طرح
اگتے سورج کی کیسریا وادیوں میں
منھ دبائے ہنس رہا ہے

●●

زرد نسلیں

لگائے درد کی وادی میں خیمہ
اداسی مدتوں اوڑھے بچھائے
دکھوں کو اپنے جو بوتے رہے صدیوں
تو فصلیں اور نسلیں زرد ہونی تھیں
پہاڑوں کی صداؤں پر ذرا جو کان دھرتے
سمجھ لیتے بلاوا بے زبانی کا
بنا کر پتھروں کو اپنا زینہ
چٹانوں پر جبیں سجدے میں رکھتے
مسافت جاری رکھتے
اور پہنچتے پار اس کے
تو پھر یہ دیکھتے سب
زمیں سرسبز دوشالے میں لپٹی
فلک ماتھے پہ سورج کا بھرے سیندور
کب سے منتظر ہے کارواں کی ــــــ!!

●●

خطا کے پتلے

ہوا کے کوڑے برس رہے ہیں
گھنے شجر پر
مچلتی شاخوں سے زرد پتّے
اک ایک کر کے
خطا کی مانند جھڑ رہے ہیں
زمیں کے دامن کو بھر رہے ہیں
زمیں جو ماں ہے
وہ اپنے آنچل میں سارے عصیاں
گناہ سارے
تمام دکھ کو سمیٹتی ہے
کہ سارے برگد اور نیم، پیپل
اسی کی مٹّی کے زائیدہ ہیں.
اسی زمیں پہ ہیں ابنِ آدم
خطا کے پتلے
جو اپنی جنت گنوا رہے ہیں —!

●●

یک رنگی اک جبر

دبیز کہرے کی شال اوڑھے
فلک پہ سورج ہے اونگھتا سا
فضا میں جیسے کہ برف پارے پگھل رہے ہیں
ہوا کی سانسیں ہیں اکھڑی اکھڑی
گھنے درختوں کے اونچے شانے
جو کل تلک تھے تنے تنے سے
بدلتے موسم میں ڈھانچا صورت
کھڑے ہیں گم سم
نڈھال شاخوں سے زرد پتّے
اک ایک کر کے ٹپک رہے ہیں
اجاڑ دکھیا کے آنسوؤں سے
سنہری صبحیں، گلال شامیں نہ نقرئی شب
یہ سرمئی دھند سارے رنگوں کو ڈھک چکی ہے
ہے زندگی پر سکوت طاری
چہار سو ہے بس ایک رنگی اجارہ داری
نہ جانے کب تک یہ جبر موسم کا جھیلنا ہے!

●●

تاریخ کے بوسیدہ پنّوں سے

عنانِ وقت کو تھامے
براجے عدل کی کرسی پہ جب سے آپ ہیں
سلگتی ہیں لکیریں سرحدوں کی
دھواں ہونے لگی ہیں بستیاں
شہروں کی گلیاں
دکاں، اسکول اور دفتر میں شعلے رقص کرتے ہیں
زباں کی لپلپاہٹ سے
کہ موسم خوف و دہشت کا
جٹاؤں سے گھنے برگد کی لپٹا ہے
زمینوں میں جڑیں اپنی جماتا جا رہا ہے
فریبی منڈیوں میں
تراشیدہ نئی سچائیوں کے بھاؤ
بڑھتے جا رہے ہیں

سفیرانِ تجارت
عقابی پنکھ میں باندھے ہوئے
دینار و درہم
فلک کو آشیاں کرنے چلے ہیں
اگانے چاند سورج اور تارے
اپنی مرضی کے
ادھر تاریخ کے بوسیدہ پنّے
ہوائے بے رخی سے پھڑ پھڑاتے ہیں
انہیں اڑتے ہوئے دیمک زدہ پُرزوں پہ چپکے سے
کہیں فرعون کا سایہ ابھرتا ہے
کہیں نمرود کی پرچھائیں پھرتی ہے
کہیں شداد کا پیکر لرزتا ہے
وہیں اک سچ
کہ اب بھی نوکِ نیزہ پر فروزاں ہے
کوئی موسیٰ نہ ابراہیم کی آمد کا امکاں ہے
نبوت ختم کب کی ہو چکی، لیکن
ابھی مچھر تو زندہ ہیں ......!!

••

گم کردہ راہ

زمیں بچھائے ہوئے مصلیٰ
ہوا کے سجدوں کو گن رہی ہے
شجر حجر سارے ہاتھ باندھے
دعاؤں میں گم
بچھڑ کے شاخوں سے زرد پتّے
صفیں بنانے کی کوششوں میں
روانی موجوں کی گنگناتی
ہے اس کی حمد وثنا مسلسل
ہیں ورد میں زیرِ لب سمندر، پہاڑ سارے
درود پڑھتے پرندے اڑتے
چرندے بے خود قلانچے بھرتے
فلک کی مٹھی میں ایک تسبیح گھومتی ہے
ستاروں والی

زمین سے اوجِ آسماں تک
یہ سلسلہ ہے کہ چل رہا ہے
ہماری زندہ بصارتوں میں
ہماری اندھی بصیرتیں ہیں
کہ سرد خانوں کی زینتیں ہیں
ہم اپنے مرکز سے ہٹ گئے ہیں
کہ فکرِ محور بدل چکی ہے!!

●●

شبستاں کے اسیر

ہم کہ ہیں اپنے شبستاں کے اسیر
کمرۂ سرد میں خوابوں کے دریچے کھولے
سوچ کی وادئی گل رنگ
نگاہوں میں بھرے
اور تصور میں کہیں
خوشبوئیں اوڑھے بچھائے ہوئے ہم
اپنی پلکوں کو کبوتر کے پروں کی مانند
روز چپکے سے سمیٹیں، سوئیں
آسماں اور زمیں
گردشیں کرتے کرتے
جانے کیا رنگ بدلتے رہے ہر پل نت دن
ہم کو معلوم نہیں......
اور ہر آن لرزتی ہے، چٹختی ہے، کھسکتی ہے زمیں

چاند سورج کی نگاہیں بھی لہو رنگ ہوئیں
ہفتِ افلاک سے زینہ زینہ
کیا کیا آفات اترتے ہیں
ہمیں، اس کی خبر کوئی نہیں
کس قدر زہر ہواؤں کی رگوں میں ہے بھرا
کیوں سمندر رہوا سونامی سماں
گریہ و آہ و بکا کتنے لبوں پر رقصاں
بستیاں تاراج ہوئیں ہیں کتنی
اور کہاں آگ میں جھلسے جنگل
ہم کو ان سب کی خبر ہو بھی تو کیسے جاناں
ہم کہ ہیں اپنے شبستاں کے اسیر
سانس لیتے ہیں مگر
ہیں تو مُردوں کی طرح سے بے حس
سرد کمرے کی فسوں خیزی میں
رات دن ایسے گزر کرتے ہیں
جیسے اہرام میں ہو کہنہ ممی......!

●●

یہ خاکداں.....

یہ خاکداں بھی عجب ہے
غبارِ درد جو اٹھے تو دل بھی آنکھ ملے
یہ خاکداں بھی عجب ہے
کہ اس کے دامن میں
ہوائے سرد کی سہرن شرار سی چمکے
بجھے الاؤ میں سوئی لپٹ اٹھا ڈالے
اڑا دے راکھ بنا کر تمام خوابوں کو
یہ خاکداں بھی عجب ہے
کہ لو کے موسم میں
دلوں کو برف رداؤں سے ڈھانپ کر رکھے
رگوں میں بے حسی بھر دے
زباں ٹھٹھر جائے
یہ خاکداں

کہ عجب ہی مزاج رکھتا ہے
ابوجھ کوئی پہیلی ہے، اک معمہ ہے
الجھتے سوت کی گانٹھوں کو کھولنے کی دھن
گزرتا وقت
کہ مٹھی سے ریت سا پھسلے
فگار عمر کہیں رائگاں نہ ہو جائے ـــــ!

●●

آڈمبر

جڑیں سوکھ جانے پر
سوکھتی ہیں شاخیں
درک جاتا ہے تنا
پھر جہاں تہاں سے
پتّیاں نہیں
اُگ آتی ہیں آنکھیں
اور زہریلے دھوئیں سے پٹے
راستوں پر
زندگی
بوجھل سانسوں کی گٹھڑی سنبھالے
عالمِ نزع میں دیکھتی رہتی ہے
عشق کا آڈمبر

●●

سورج کی بشارت

سمندر لکھنا چاہا
اور قلم ریت سے بھر گیا
دشت سوچا
سراب ضدّی بچّوں کی طرح
کاغذ پر پاؤں پٹکنے لگے
چاند کی مسکان
تاروں کی کھلکھلاہٹ
آنکھوں میں کہرے بھر گئی
چاہا دھرتی پر بچھی
ہریالی سمیٹ لوں

جنگل
زرد پتوں کی لرزش
انگلیوں میں اتار گئے
باوجود
دور وادی کی گہری تاریکیوں میں
نوکِ سبزہ پر تھرتھراتے اوس قطرے
سورج نکلنے کی بشارت دے رہے ہیں !!

●●

شتر مرغی تماشے

تماشے خوب ہیں یہ
دعاؤں کی چمکتی جھنڈیوں سے
فصیلیں اور محرابیں سجائیں
پرانے مخملی جزدان میں لپٹا صحیفہ
اُچک کر طاقِ نسیاں سے اتاریں
یا مصلّوں پر
کئی نفلوں کی نیّت کر کے بیٹھیں
یا کوئی تعویز اونچی شاخ سے ٹانگیں
کنارے بستیوں کے
اذاں کی گونج سے باندھیں
کوئی تقریری مجلس
جو لہو کو گرم کرتی ہو

یہ سب کے سب
نٹھلوں کے شتر مرغی تماشے ہیں
ہمارے ہوش کے ناخون توٹوٹے ہوئے ہیں
بلائیں
بستیوں میں بلبلاتی پھر رہی ہیں !!

●●

آسماں محافظ ہے

اونچے برف زاروں کی
چوٹیاں اٹھائے سر
ناچتی ہواؤں کی
تھاپ سے سراسیمہ
وادیوں سے کہتی ہیں
حوصلہ نہیں کھونا
آسماں محافظ ہے !!

●●

رات

رات
آنکھوں میں کھاٹ بچھائے
تھالی سے تارے چُنتی
اور ہوائیں
آتے جاتے حقہ گڑگڑاتیں
خواب
نرم گدیلے میں
گپ چپ ہنستے
اور کبھی مٹھی باندھے لڑتے
کن من روتے
بوندیں اوس کی پیتے جاتے
جھینگروں کی جھنکار
بھیانک سُرتال سے

سناٹے میں سہرن بھرتی
جھاڑیوں میں تھکی ماندی پڑی
جگنوؤں کی فوج ہتھیار ڈالے
گم سم
اور جنگل منتظر ہے
چڑیوں کی چہکار کا
کالی رات کتنی طویل ہے !!

●●

خاشاک ملبے کو کریدو

کریدو !
جل بجھے خوابوں کے اس
خاشاک ملبے کو
شرر کوئی ہو شاید
اُڑے، لپکے
یہ سر گھٹنوں میں ڈالے
سوچنا کیا !
گریباں پھاڑنا
خود سے الجھنا کیا
ذرا سوچو
قدم رک جائیں تو
کیا راستہ بھی ختم ہوتا ہے
کہ سب کچھ ختم ہونے پر بھی

پھر آغاز ہوتا ہے
نہیں،
پسپائی کا مطلب نہیں ہرگز
کہ تم
میدان ہی سب کھو چکے ہو
خزاں دیدہ شجر پر
کونپلیں پھر سے نہ آئیں
یہ کس نے کہہ دیا ہے
کریدو راکھ
شاید
اک شررِ زندہ نکل ئے !!

●●

ہُد ہُد

بدلتے وقت کا ہُد ہُد
ابھی بھی مخبری منصب سنبھالے
جدھر چاہے اشاروں پر گھماتا ہے
پرندے
اپنی منقاروں میں چہکاریں سجائے
مگن ہیں شہر یاری مدحتوں میں
زمیں چپ ہے
کہ اس کی بوڑھی آنکھوں میں
زمانوں کی رقم تاریخ زندہ ہے
مگر
سبائی سلطنت کا خواب لے کر
ہوا بردوش ہے تختِ سلیمانی۔۔۔۔!

●●

گونج

کئی صدیوں سے
ہونٹوں پر لگے
وہ سنگی قفل سارے اب کے ٹوٹے ہیں
یہ گویائی
نہ کمخوابی، حریری، اطلسی ہے
نہ دیواروں کے اندر
چھپی پرچھائیاں سرگوشیوں کی
یہ گویائی
چٹانوں میں شگافیں ڈال کے
رستے میں آئے پتھروں کو
جوتیوں کی نوک پر رکھتی
جو لحنِ آبشاری میں رجز پڑھتی
لہو کو گرم رکھنے کا سلیقہ بخشتی ہے

سنو !

اس گونج کو اپنے دلوں میں بیج ہونے دو

کہ اگلی نسل

ان فصلوں سے پائے گی

تحفظ اور بقا کی

امنِ انساں کی

نمو بردوش ہریالی !!

●●

شفق زادو

یہ اُدھم، شور و غوغا اور تھوڑی دیر
فلک جب اپنی مٹھی سے نکالے گا
گھنی تاریک کالی شب
تمہارے رنگ سارے
گہری سیاہی میں گھلیں گے
ڈوب جائیں گے
کہ کالا رنگ
سب رنگوں کی شوخی اور شرارت
اور تکبّر چاٹ جاتا ہے
کوئی فرعون یا نمرود یا ہٹلر
ورق تاریخ کے شاہد ہیں
کالے کارناموں سے
سبق لیتے کہاں ہو تم

تمہیں اگیا نتا کے شعلہ رنگوں میں
ڈبو کر
کوئی خود کو
خدا ہونے کی طاقت کے بھرم میں ڈالتا ہے
تمہیں شطرنجی مہروں کی طرح
بساطِ زعم پر رکھتا ہے
اپنی چال چلتا ہے
شفق زادو !
تمہاری ساری اُدھم اور تھوڑی دیر
سیاہی
چپکے سے شہہ مات والی چال چلتی ہے
یوں ہی بازی پلٹتی ہے
ذرا سی دیر
تھوڑی دیر-----!!

●●

زوال

تم بوئے گئے تھے
آنکھوں کی زرخیز دھرتی پر
کہ روشنیوں کے شگوفے
کھلتے رہیں
مگر فصلیں
لہو کی کیاریوں سے
زبان کی بنجر سطح تک
اُگ آئیں ہیں
کیکٹس اور ببول کی صورت
تو کیا مان لیں ہم
کہ تمہاری بھی
ڈرافٹنگ ہو چکی ہے !!

●●

سبز رُت خیال

اُدھاری روشنائی سے
بھرا قلم
ورق ورق پسارتا
سیاہ کرتا جا رہا ہے
روز و شب کی فکر کو
لہو کی بوند
خامۂ شکستہ کی رگوں میں خشک ہو چکی
رواج اب کہاں رہا
کہ سبز رُت خیال کی زمین پر
برگ، لفظ و معنی کے اُگا سکیں
ہرے بھرے شجر بھی واہمہ ہوئے
بدلتا وقت اپنی چال چل رہا
مگر ——

کہیں پہ اک امید
جگنوؤں کے روپ میں
ہے جگمگاتی کانپتی
کہ تھامنے کو ہے کرن بچی ہوئی
تو کیوں نہ اس کے نور سے
نیا قلم تراش لیں
نئے چراغ جل اٹھیں !!

●●

پُنر جنم

شاہزادوں کو اپنے بچانے کی خاطر
اڈتی
صداؤں کی شطرنجی چالوں کو سمجھو
وقت کے کوڑے دانوں میں
پھینکے ہوئے
سارے چہرے ہیں
جن کی زباں کو
جنسِ مخالف کو مجرم بنانے کی
گھُٹی چٹائی گئی ہے
کتنی صدیوں سے ان کی
یہی سوچ
تاریخ کا کالا صفحہ بنی
اب پتنگوں کی صورت

سرِ آسماں
رقصِ وحشت میں گم ہے
ہاں، وہی
جس نے لنکا کے فاتح سے
بنتِ جنک کے لیے
کتنے معصوم لہجے میں
اَگنی پر کچھا کا گھٹیا تقاضا کیا تھا
سند پاکبازی کی
ان کے ہی مہروں سے روشن رہی ہے
ہزاروں برس کے سفر نے تو
وحشت کو پالا ہے پوسا ہے
امرت پلا کر توانا کیا ہے
پُنر جنم کے سَو بہانے گھڑے ہیں
ابھی وقت ہے
ان کو پہچان لو...... !

●●

مری بچّی

مری بچّی !
تجھے ورثے میں سونپوں گی
میں لفظوں اور معنی کی
وہ دولت
جو تری جاگیر ہوگی
کہ جس پر صرف تیری دسترس ہوگی
تصرف میں تری
تا عمر رہنے پر
خزانہ کم نہ ہوگا
حرف و معنی کا
مری بچّی !
کہ میرے پاس تیرا حق
بہ صورت حرف و معنی کے سوا کیا ہے......!!

●●

اندھا سفر

ہمکتے مچلتے
کبھی خواب آنکھوں سے باہر کھڑے ہیں
کبھی جلتے دیپک کی لَو پر لپکتے
کبھی نرم بہتی ہواؤں کا پلّو پکڑتے
جمانے کی کوشش میں دھرتی پہ پاؤں کو
گرتے سنبھلتے
ذرا چوٹ لگتی بلکتے سسکتے
یہ سب دیکھ کر میں
یہی سوچتی ہوں
فریبی زمانے سے کیسے بچاؤں
انہیں اپنی پلکوں میں کیسے چھپاؤں
کہ اب میرے چہرے پہ آنکھیں کہاں ہیں
شکستہ بصارت کی قبریں ہیں جاناں!

مری جان پیروں سے کھنچنے لگی ہے
مرے ہاتھ اب ان کے رخسار کی بھی
نمی پونچھنے سے گریزاں ہوئے ہیں
زباں لڑکھڑاتی
کوئی لفظ کہنے سے قاصر ہوئی ہے
میں یہ جانتی ہوں
کہ اندھے سفر پہ نکلنا ہے مجھ کو
مگر جب تلک
سوچ کی مجھ میں لہریں ہیں زندہ
دعاؤں میں مشغول ہوں
کیا کروں کیا کہوں
کچھ بھی کہنے کی کرنے کی ساعت
تو دامن چھڑا کر
الگ ہو چکی ہے
موت پنجرہ لیے پائنتی پر کھڑی ہے......!

●●

آشرم

(باباسائیں کے لیے)

کہاں ہو تم ؟
کھلی باہیں بلاتی ہیں دروں کی
سراپا ڈھونڈتی رہتیں
نگاہیں آشرم کی
کواڑوں پر لٹکتے قفل
زنگ آلود ہیں لیکن
چھپائے اپنے اندر ہیں
خزانے بیتی یادوں کے
دریچے آج بھی سرگوشیاں کرتے
وہیں سیڑھی پہ اب بھی اک سراپا
نور کا
مشعل دکھاتا ہے

چلے آؤ
کہاں ہو تم
ذرا دیکھو تو آ کر اس کھلی چھت پر
تمہاری آہٹوں کو سینت کر رکھےّ ہوئی ہے
جہاں اب بھی
تمہاری قرأتوں کے سُر
ہوا میں گونجتے ہیں
وہیں
بچوّں کی ہیں کلکاریوں کی بازگشت اب بھی
غبار آلود ہے اب آئینہ خانہ
بلاتا ہے تمہیں
کہ گرد پونچھو
پھر سجاؤ پہلے جیسا ہی
شکیل ! آؤ،
کہاں ہو تم !!

●●

غزلیں

چھتیں ہواؤں کی دیوار و در تھے پانی کے
طلسمی شہر میں ہر سمت گھر تھے پانی کے

پھوار ، بارشیں ، سیلاب ، بلبلے ، شبنم
کھلا یہ ہم پہ کہ کیا کیا ہنر تھے پانی کے

کئی جنم سے مقدر میں صحرا گردی تھی
اور اب کے پاؤں سے لپٹے سفر تھے پانی کے

گئے وہ دن کہ پرندوں نے آشیانے بُنے
نئی زمین پہ سارے شجر تھے پانی کے

سَنی پڑی ہوئی مٹّی بھی چاک بھی پانی
چراغ گھڑتے ہوئے کوزہ گر تھے پانی کے

حباب چہروں کا یہ شہر بھی عجوبہ تھا
لباس اوس کے اور بخیہ گر تھے پانی کے

یہ معجزہ جو نہیں تھا تو کہکشاں کیا تھا
کہ برف آگ بگولہ شرر تھے پانی کے

●●

بساطِ وقت پر دیکھو کہاں رکھّے ہوئے ہیں
جو پیادے تھے سرِ بزمِ شہاں رکھّے ہوئے ہیں

ہم اپنی بند مٹھی کھول دیں پھر دیکھنا تم
سمیٹے کس طرح ہفت آسماں رکھّے ہوئے ہیں

کبھی تو منصفی پہنے قبائے پاک ہو گی
سو ہم اس طور دل کو خوش گماں رکھّے ہوئے ہیں

بظاہر سرسری سے رابطوں میں کیسے کھلتا
دبا سینے میں اک آتش فشاں رکھّے ہوئے ہیں

تمہارے قرب کا لمحہ نہیں بھر پائے گا وہ
پرانے فاصلے جو درمیاں رکھے ہوئے ہیں

انہیں سے پوچھنا تھا رنگِ موسم کیسے بدلا
کہ نبضِ وقت پر جو انگلیاں رکھے ہوئے ہیں

یہ پرچھائیں سی اوڑھے کون ہے ہم تو نہیں ہیں
بھرم بے سائیگی کا کہکشاں رکھے ہوئے ہیں

●●

کوئی دھنک کی راہ سے گزرا کوئی فلک تک پہنچا ہو
اب کے شہرِ رنگ میں دیکھیں کس کا کس کا چرچا ہو

ایک سمندر کی لہریں، تم ساحل پر، ہم بیچ بھنور
اک دوجے سے ملنا ہو جب موج پہ چڑھتا دریا ہو

اک خوش فہمی نشہ بن کے رگ رگ میں پھر دوڑ گئی
میرے ہاتھ کی ریکھاؤں میں نام تمہارا لکھا ہو

کوئی آہٹ، کوئی ہلچل، کوئی صدا نہ گونج کوئی
ایک چراغِ تنہائی بس بام و در پہ جلتا ہو

پائل باندھے شاخ ہوا کی ابٹن دھوپ کی ملتی ہو
پیلے پتّوں کا جھومر ہو اور زمیں کا چہرا ہو

بام و در پہ تنہائی کی بیل تبسم پھیل گئی
گھر آنگن میں سناٹے کا جھینگر شور مچاتا ہو

••

تم کیا جانو کیوں آنکھوں میں بے خوابی کا صحرا ہے
تم کیا جانو جنبشِ لب پر کیسا کیسا پہرا ہے

تم کیا جانو بازی گر کی چال یہ ڈھائی گھر کی ہے
تم کیا جانو شہہ بے چارا پٹنے والا مہرا ہے

تم نے رڈی چننے والے ہاتھوں پر کب غور کیا
تم کیا جانو ان پوروں میں کون سا موسم ٹھہرا ہے

ہاتھ کی الجھی ریکھاؤں میں خوش بختی کا نام نہیں
تم کیا جانو میرا تارا شمس، قمر یا زہرا ہے

تم کیا جانو شاخِ مژہ پہ جگنو کی بارات ہے کیوں
تم کیا جانو زخم جگر کے اندر کتنا گہرا ہے

جانے تم کس دُھن میں تبسم ان راہوں پر آنکلی
تم کیا جانو دردِ مسافت آگے ریت کا صحرا ہے

●●

بس تھوڑی دیر اور دلوں پر عذاب رُت
پھر شاخِ جاں تلاش کرے گی گلاب رُت

گو دل میں موجزن سا رہا بحرِ بے کنار
شاخِ مژہ تک آئی بھی گر تو حباب رُت

سب زعمِ احتیاط دھرے کا دھرا رہا
دستار سر سے لے گئی عالی جناب، رُت

ہے کس کا حوصلہ جو کرے سر اٹھا کے بات
مسند نشیں ہے شہر میں اب آفتاب رُت

تعبیریں برگِ سبز کی صورت اُگیں گی کیا
اتری نہ میری آنکھ میں جب کوئی خواب رُت

کب تشنہ تھا جزیرۂ بے خواب کہکشاں
دشتِ نگہہ پہ سایہ فگن تھی سحاب رُت

●●

موجِ دریا بھی مخالف اور بھنور میرے خلاف
عرصہ موجود میں میرا سفر میرے خلاف

خود سے دونی عمر کے اک شاہ زادے کے لیے
اک ذرا سی 'نا' پہ دیکھا سارا گھر میرے خلاف

پتھروں سے میں نے بھی چاہا تراشوں ایک بت
پر تھا دستِ آزری تیرا ہنر میرے خلاف

ہے ستاروں سے پرے نادیدہ اک روشن جہاں
اک خبر بھر سے ہوئے ہیں بال و پر میرے خلاف

زندگی انعام کی صورت تھی شرطوں سے بندھی
مرحلہ در مرحلہ ، شام و سحر میرے خلاف

موسموں کی نبض پر رکھی تھیں میں نے انگلیاں
اور ہوا تیور چڑھائے ہر شجر میرے خلاف

پاؤں میں پائل سفر کی باندھ لی، جب کہکشاں
دیکھیے ہوتی ہے کب تک رہ گزر میرے خلاف

●●

گزرتے جاتے ہیں باتیں ہزار کرتے ہوئے
یہ کون لوگ ہیں رستہ غبار کرتے ہوئے

ہر ایک دن گیا چھالوں کی آبرو رکھتے
ہر ایک شب گئی جگنو شمار کرتے ہوئے

بچھڑ کے مجھ سے کہیں دشت تو اداس نہیں
خیال آیا تھا دریا کو پار کرتے ہوئے

بلائیں اوڑھ کے بادل ہیں رقص میں پیہم
قبائے لالہ و گل تار تار کرتے ہوئے

زمیں تھی خاک، فلک بھی دھواں دھواں دیکھا
دھنک کے رستے خلاؤں کو پار کرتے ہوئے

وہ خوش گمانی پہ اپنی بہت ہیں شرمندہ
جنہیں تھا فخر تمہیں شہر یار کرتے ہوئے

کوئی تو رشتہ دعا کا بھرم ہی رکھ لیتا
گلے ملے گا مگر کار و بار کرتے ہوئے

●●

خموشیوں نے دی صدا کمال دیکھنا ذرا
بھرا ہوا ہے کاسۂ سوال دیکھنا ذرا

دھنک کے رنگ سبز رُت کی ہمرہی گھڑی پہر
ہے مستقل نظارۂ زوال دیکھنا ذرا

ملاحتیں نہ رونقیں نہ شوقِ دید کی چمک
یہی ہے رنگِ شہرِ خوش جمال دیکھنا ذرا

وہی ادائے منصفی الگ کہاں عدالتیں
سزائیں سب رہیں مری بحال دیکھنا ذرا

سمندروں کی کھوج میں کدھر چلی یہ تشنگی
حدِ نظر ہے دشتِ بے غزال دیکھنا ذرا

ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ زد پہ کون کون ہے
ہوائیں ہو گئیں مگر نڈھال دیکھنا ذرا

کٹے ہیں کیسے روز و شب مسافتوں کے درمیاں
ورق ورق کتابِ ماہ و سال دیکھنا ذرا

خزاں گزیدہ شاخ پھر ہری ہوئی ہے کہکشاں
گزر چکی ہے ساعتِ ملال دیکھنا ذرا

●●

زمیں کے ٹکڑے کیے آسمان بانٹے گا
وہ شاہِ وقت ہے سارا جہان بانٹے گا

لٹے گا جس کے اشارے پہ زورِ گویائی
وہی تو بعد میں گونگی زبان بانٹے گا

رکھے رہے گا وہ تیروں پہ دسترس اپنی
ہمارے بیچ تو خالی کمان بانٹے گا

جو کاٹ لے گیا فصلِ یقین کھیتوں سے
پلٹ کے آئے گا شاخِ گمان بانٹے گا

کترکے پنکھ ہمارے دروں کو کھول دیا
خبر ملی تھی کہ اونچی اڑان بانٹے گا

کہاں وہ درد کا رشتہ رہا سلامت اب
جو ہاتھ تھام کے ساری تکان بانٹے گا

تمام چہرے دھواں ہو گئے تبسمؔ جب
تو کس کے بیچ وہ شہرِ امان بانٹے گا

●●

مانگے ہے اک ستارہ سرِ آسمان پھر
دل چاہتا ہے سوئے افق ہو اڑان پھر

پھر اے قفس نشینوں اٹھاؤ دعا کو ہاتھ
ہے شاخ شاخ موسمِ وہم و گمان پھر

ہر لمحہ کس محاذ کی جانب سفر میں ہے
کھینچے ہوئے رگوں میں لہو کی کمان پھر

دریاؤں کا یہ چپ تو خطرناک ہے بہت
باندھو بلند شاخ پر لوگو مچان پھر

پہلے خراج مانگ رہا ہے امیرِ وقت
لوٹائے گا وہ شہر میں امن و امان پھر

دل تنگ ہو گیا تو زمیں بھی ہوئی ہے تنگ
ہم خواب کے نگر میں بنائیں مکان پھر

ان ہچکیوں کا کچھ تو سبب ہو گا کہکشاںؔ
شاید کسی کو آیا کہیں میرا دھیان پھر

●●

بے گھری کے دکھ سے بہتر ہے سفر باقی رہے
پاؤں کے تھکنے تلک بس رہ گزر باقی رہے

شہرِ جاں میں بے رخی کے زرد موسم ہیں تو کیا
صحنِ جاں میں خوشبوؤں کا اک شجر باقی رہے

گھر نہیں حرمت نہیں محفوظ تو پھر شہریار
کس کی خاطر اپنے کاندھوں پہ یہ سر باقی رہے

میرے اس کے درمیاں ہے روشنی کا رابطہ
ٹمٹماتا اک دیا جوں طاق پر باقی رہے

ہم بھی کچھ تو آزمائیں اپنے خوں کی حدّتیں
موجِ دریا تہہ بہ تہہ تیرا بھنور باقی رہے

موسمِ سفّاک کی جب زد پہ ہے شہرِ پناہ
کیوں امیرِ شہر تیرے نامِ در باقی رہے

کہکشاں الفاظ سے معنی کے رشتے کٹ گئے
بے صدا خاموشیوں کے بس کھنڈر باقی رہے

●●

نقدِ سوال لے کے پھروں تیرے شہر میں
خاموشیوں کی گونج سنوں تیرے شہر میں

ہے قید کس طلسم میں جاں کا شجر یہاں
برگِ صدا پہ قطرۂ خوں تیرے شہر میں

اَن جان فاصلوں کا سفر کر کے تھک گئی
اب کے ذرا سی دیر رکوں تیرے شہر میں

ہیں کاسۂ صدا میں کھنکتے ہوئے سوال
ہونٹوں پہ سب کے قفل ہے کیوں تیرے شہر میں

تو نے تو مجھ سے چھین لی پہچان ہی مری
کیوں ہو کے بے نشان رہوں تیرے شہر میں

آسائشیں حساب سے زیادہ ملیں، مگر
نایاب شے تھی دل کا سکوں تیرے شہر میں

ہر شخص کو ہے شوق خدائی کا کہکشاں
کس کس کے آگے سجدہ کروں تیرے شہر میں

●●

موسم، خوشبو، رنگ دھنک کے، منظر سارے اس کے تھے
رات کی کالی چھایا میری، چاند ستارے اس کے تھے

بیچ سمندر بخت ہمارا ساحل تک یہ آتا کب
موج ہوا پہ نام تھا اس کا دور کنارے اس کے تھے

سہمی سہمی، گونگی، بہری ایک گُڑیا میری تھی
ہنستے گاتے' ڈھول اڑاتے راج دلارے اس کے تھے

اک چھوٹی سی چھت کی خاطر کیا کیا خواب گنوا بیٹھی تھی
بھول گئی کہ اینٹیں اس کی مٹّی گارے اس کے تھے

زنجیروں کے بدلے اب بھی گہنے پاتے بنتے ہیں
صدیوں سے یہ جبر کے بندھن بیچ ہمارے اس کے تھے

کتنی عجب تقسیم تبسمؔ کرتی ہے یہ دنیا بھی
میرا حصہ زہر ہلاہل، امرت دھارے اس کے تھے

●●

گھروں سے نکلے نہیں جب خریدنے والے
دکاں بڑھاتے گئے خواب بیچنے والے

ہوا کے دوش پہ رقصاں ہے شہریار ابھی
خموش بیٹھے ہیں دھاگا لپیٹنے والے

زمیں نچوڑ کے کاسہ تو بھر چکے اور اب
فلک سے ہیں مہ و انجم سمیٹنے والے

اڑی جو راکھ تو شعلہ لپک نہ جائے کہیں
خیال رکھ ! ذرا ماضی کریدنے والے

زمینِ عشق کی شادابیاں ہمیں سے ہیں
ہمیں نہ چھیڑ ! جڑیں اپنی کھودنے والے

لٹا ہی بیٹھے بصارت ہوس کے جلووں میں
زمین پاؤں کے نیچے سے کھینچنے والے

تمہاری فکر رہے کہکشاں سلامت بس
وہ اور لوگ ہیں شہرت بٹورنے والے

●●

مری پہچان کا ہر اک حوالہ چھین لے گا
یہ عہدِ جبر ہے سر سے دوشالہ چھین لے گا

شکم کی آگ میں گھی ڈالنے کا کام کر کے
وہ سب کمزور ہاتھوں سے نوالہ چھین لے گا

ابھی اس کے نشانے پر حرم ہیں دیکھنا پھر
زمیں کی گود سے اک اک شوالہ چھین لے گا

وہ بازی گر ہے اس کے کھیل سے ہشیار رہنا
مقید شبہ کو رکھے گا رسالہ چھین لے گا

بدل کے جبریہ تاریخ یرقانی کرے گا
تمہارے نام صدیوں کا قبالہ چھین لے گا

دکھا کے چاند، سورج، کہکشاں کی خوش گمانی
وہ سب آنکھوں سے جگنو بھر اجالا چھین لے گا

●●

ہوئی ہے سدِ راہِ گفتگو اس بار بھی برف
پرندوں کی اڑانیں شوخیٔ منقار بھی برف

کہاں پر نقدِ جاں کو بیچنے کی بات ہوتی
ہے ارزانی کی رُت اور گرمیٔ بازار بھی برف

سمندر موجۂ شعلہ سا بہتا درمیاں ہے
زمیں اِس پار بھی یخ زمیں اُس پار بھی برف

زباں ناقوس کی چپ اذاں کی لے بھی جامد
حمائل گردنوں میں سبحہ و زُنار بھی برف

زمینِ وسوسہ دلدل سی ہو جائے نہ پھر سے
قدم سہمے ہوئے اور گرمئ رفتار بھی برف

مداری اپنے کرتب کو رکھے جاری تو کیسے
جنوں شہکار مٹّی کا لبِ اظہار بھی برف

عجب یخ بستہ موسم سروں پر خیمہ زن ہے
مرا چوپال ساکت ترا دربار بھی برف

شکستہ گھر رکھے دستک کی امیدیں بھی کیسے
ہیں لب بستہ دریچے در و دیوار بھی برف

●●

رہے شانوں پہ جب تک سر سلامت
ستم کے ہاتھ میں خنجر سلامت

دھماکے، خوف، دہشت، بے پناہی
عذابِ شہر کے منظر سلامت

ہوا کی سازشیں بڑھنے لگی ہیں
کہاں دھرتی پہ کوئی گھر سلامت

لہو کا گرم جھرنا سا جبیں پر
منافق شہر کے پتھر سلامت

کہاں گھر ہے کہاں گھر کی امانت
ہے تیرے عہد میں بس ڈر سلامت

گھٹن ہے قبر کی محلوں میں اس کے
مرا یہ پھوس کا چھپر سلامت

ہیں چہرے پر نشاں شادابیوں کے
کھنڈر ہے روح کے اندر سلامت

کہاں اب کہکشاں آنگن کی رونق
کہ گھر ویراں ہے اور دفتر سلامت

●●

پھر موسمِ یخ بستہ بدلنے کی خبر دے
رگ رگ میں جمی برف پگھلنے کی خبر دے

یا دل کے چراغوں کو لہو اور عطا کر
یا راہ میں پھر چاند نکلنے کی خبر دے

یا موسمِ خوش رنگ کوئی بھیج زمیں پر
یا گردشِ افلاک بدلنے کی خبر دے

بس اڑتے بگولے ہیں سرابوں کے سفر میں
ایڑی سے کوئی چشمہ ابلنے کی خبر دے

در بند کئے لوگ گھروں میں ہیں مقید
آسیب زدہ رات کے ڈھلنے کی خبر دے

بھیگی ہوئی لکڑی ہوں دھواں دیتی ہوں پہروں
اب مجھ کو مری آگ میں جلنے کی خبر دے

اخبار بھی دہشت کا تراشا ہے تبسم
ہر صبح فقط دل کے دہلنے کی خبر دے

●●

سفر کے شوق میں پیہم سفر پہ زندہ ہیں
کسی بہانے سہی رہ گزر پہ زندہ ہیں

اگر ہے رات اندھیری تو سوچنا کیسا
ابھی تو خواب کے جگنو شجر پہ زندہ ہیں

کہے گا کون انہیں انتظار ختم کرو
وہ ماں ہیں خیر کی جھوٹی خبر پہ زندہ ہیں

تمام کوششیں کر کے ہوائیں ہار گئیں
چراغِ خواب مگر بام و در پہ زندہ ہیں

ہر اگتی گھاس میں، سر سبز بیل میں یادیں
گئے دنوں کے شکستہ کھنڈر پہ زندہ ہیں

نظر ہے گردشِ دوراں کی چاک پر ہر پل
کہ ہم بھی کوزہ گروں کے ہنر پہ زندہ ہیں

مخالفت میں ہے دریا مگر تبسم ہم
بلا کی موج میں بنتے بھنور پہ زندہ ہیں

●●

نئی رُتوں میں پڑا کہکشاں یوں پالا پھر
لہو سے بھرنے لگا زخم کا پیالہ پھر

زوالِ دل کی الگ داستان کیا ہوتی
وہی حرم و کلیسہ وہی شوالہ پھر

کہاں وہ سوز کہ پگھلا کے دل کو موم کرے
کہاں وہ عشق کہ دیتا کوئی حوالہ پھر

سنہرے خواب کہ زندہ رہیں گے بعد مرے
چراغِ شب ہے سلامت بہت اجالا پھر

سفر تھا شرط نشیب و فراز مت پوچھو
بلک کے پھوٹ پڑے پاؤں کا نہ چھالا پھر

ردائے سر نہ بناتی تو چین سے رہتی
عذاب ہوتا نہ کانٹوں بھرا دوشالہ پھر

●●

سدا قربتوں کی مثال کیا کبھی ہجرتوں کا حساب کر
یہ گھڑی پہر کی نہ بات کر مرے رتجگوں کا حساب کر

مرے آنسوؤں کے چراغ سے ترے بام و در پہ ہے روشنی
یہ مرے لہو کے شرار ہیں انہی جگنوؤں کا حساب کر

مجھے لا ورق سے نکال کر مرے روز و شب کا شمار کر
میں گئے دنوں کا کھنڈر سہی مری مدّتوں کا حساب کر

تری یاد بھی تھی سراب سی رہا دشتِ جاں یونہی تشنہ لب
مرے آبلوں کو زباں ملے جو مسافتوں کا حساب کر

ترے نام ہیں مرے روز و شب ترے نام پر بنے خواب سب
ترا نام چھاؤں بھرا شجر مرے موسموں کا حساب کر

میں خزاں گزیدہ شجر سہی مری ٹہنیوں کی خبر تو لے
گرے زرد پتّوں کے ڈھیر سے ہری کونپلوں کا حساب کر

تری زندگیؔ کے فلک پہ میں رہوں کہکشاں سی تمام عمر
ترے صحنِ جاں میں ہوں بیل سی مری خوشبوؤں کا حساب کر

●●

دکھوں کی بھیڑ میں اپنے پرائے ایک جیسے تھے
سرکتے ڈگمگاتے سارے سائے ایک جیسے تھے

ہمارے شہر کا سورج تمہیں بھی دھوپ دیتا تھا
ہواؤں نے بھی جو ملہار گائے ایک جیسے تھے

انا کی سنگی دیواریں علیحدہ رکھتی ہیں ، ورنہ
جو سارے روز و شب ہم نے بتائے ایک جیسے تھے

ہراس و خوف کے لمحے گمان و وہم کے موسم
ابھی تک ہم نے جو اوڑھے بچھائے ایک جیسے تھے

دلوں کے درد بھی یکساں لہو کے رنگ بھی یک رنگ
کہ ہم نے ہجر کے جو زخم کھائے ایک جیسے تھے

●●

تنی ہوئی ہے ابھی تو قنات کہرے کی
کھِلے گی دھوپ تو پھر ہو گی مات کہرے کی

نگاہیں سب کی شعاؤں کے خواب بُنتی ہیں
مگر لبوں پہ مسلسل ہے بات کہرے کی

سیاہ شب کے کڑے مرحلے تو ختم ہوئے
ہے اب حیات کو درپیش گھات کہرے کی

گھروں میں اپنے ہر اک انس جاں اسیر ہوا
ہے کوئی جبر یا پھر التفات کہرے کی

کہیں رگوں کا لہو برف میں نہ جم جائے
عذابِ جان ہے تکلی نہ کات کہرے کی

امیرِ وقت ہے سورج کو بیچنے والا
زمیں پہ رکھّے گا باقی حیات کہرے کی

خیال و فکر تبسّم ٹھٹھر گئے ہیں کیا
لکھو تو کھل کے ذرا واردات کہرے کی

●●

تا عمر کونپلوں کا رہا آسرا مجھے
موسم کی کی کوکھ بانجھ تھی دیتی بھی کیا مجھے

کہنے کو ہیں پرند مگر فاختاؤں سے
سوئے فلک اڑان کہاں حوصلہ مجھے

ہر پل مہاجروں کی طرح در بدر ہوئے
خانہ بدوش عہد کا ہے سامنا مجھے

آنکھوں سے منظروں کی دھنک نوچ لے گئی
بے رنگ و نور کر گئی اندھی ہوا مجھے

میں صورتِ سحاب چلی آؤں تیری سمت
تو دشتِ جاں کی دھوپ میں دے تو صدا مجھے

اب رنگتِ زوال کا منظر ہے زندگی
کس ساعتِ ملال میں پیدا کیا مجھے

اندھا یقین ہے تو فقط اس کی ذات پر
جس نے شبِ سیاہ میں جگنو کیا مجھے

اک تیغِ بے نیام کی صورت یہ ساعتیں
کس جرم کی ملی ہے تبسم سزا مجھے

●●

اک بھرم سا تھا تحفظ ہے گھروں کے درمیاں
کب تھے دروازے سلامت چوکھٹوں کے درمیاں

اڑ رہے تھے پنکھ پھیلائے پرندے مضطرب
آگ پھیلی شہر کی جب جنگلوں کے درمیاں

دشت کی تقدیر پھر پیاسی کی پیاسی ہی رہی
بہتا دریا رقص میں تھا بستیوں کے درمیاں

خواب کا موسم تری جاگیر بن کر رہ گیا
میں نے ساری عمر کاٹی رت جگوں کے درمیاں

اس کو بھی زعمِ انا تھا میں بھی کچھ خوددار تھی
قربتیں بڑھتیں بھلا کیا فاصلوں کے درمیاں

آ کے میری آنکھ میں تخمِ گلستاں بو گیا
ایک لمحہ سرپھرا تھا موسموں کے درمیاں

قافلے کی خیر یارب کچھ تو بادل بھیج دے
وسعتِ صحرا کی جانب آندھیوں کے درمیاں

اور کس کے نام کا قرعہ نکلتا کہکشاں
ایک ہم ہی بچ رہے تھے قاتلوں کے درمیاں

●●

گہری کالی رات میں لپٹا بھیگا بھیگا کل
میرا آنچل تھام کے رویا بھولا بسرا کل

میرے گاؤں کے سارے سپنے پھر دریا کی نذر
پھوس کے چھپر بیل کی جوڑی دھان اگاتا کل

دھوپ میں پہروں کاغذ چنتے جسم خزاں کی شاخ
سادہ چائے میں سوکھی روٹی کھانے والا کل

خون رگوں کا چوس رہی ہے قطرہ قطرہ دھوپ
پیاسی آنکھیں کھوج رہی ہیں بادل جیسا کل

پیپل کا وہ پیڑ تبسم پیچھے چھوٹ گیا
جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھیلا بھولا بھالا کل

●●

ترے حضور میں فریاد کیا ، دہائی کیا
ہمارے درد ہی گونگے ہیں دیں صفائی کیا

لہو کی شاخ ہری ہے بہت غنیمت ہے
دریدہ پیڑ سے کونپل کی آشنائی کیا

تمام عمر رہا پل صراط پر چلنا
عجیب قید تھی ملتی بھلا رہائی کیا

ہماری آنکھ میں کاجل سا بن گیا ساون
مژہ پہ جمنے لگی آنسوؤں کی کائی کیا

مسافرت ہے مقدر تو سوچنا کیسا
کہ آگے دشت ہے، پربت ہے یا ترائی کیا

ہمارا جرم تو ثابت نہیں مگر دیکھو
ہمارے نام پہ ہوتی ہے کاروائی کیا

چراغ زخم کے جلتے ہیں کہکشاںؔ ہر پل
سنور گیا ہے مرا کاسۂ گدائی کیا

●●

کبھی تو رنگ مری ذات کا سنور جائے
کوئی تو ہو جو مری سوچ میں اتر جائے

بہت سے حادثے اس رہ گزر سے لپٹے ہیں
سفیرِ شب سے کہو لوٹ کے وہ گھر جائے

گھٹن کا دکھ نہیں الفت قفس کی حاوی تھی
رہائی پانے سے بہتر لگا کہ مر جائے

ہوا بھی تیز ہے گھنگھور ہے اندھیرا بھی
چراغ لے کے وہ حیران ہے کدھر جائے

مزاج اس کا بدلتا ہے آنسوؤں کی طرح
مگر یہ دھن بھی کہ ہر جرم میرے سر جائے

پلٹ کے دیکھنا دکھ اور بھی بڑھائے گا
چلے چلو کہ یہ دشتِ بلا جدھر جائے

عزیزِ جاں ہیں دلارے ہیں دکھ اسے کہنا
کچھ اور درد تبسم کے نام کر جائے

●●

پرچھائیاں تھرکنے لگیں آس پاس پھر
تنہائیوں کا درد ہوا ہے اداس پھر

پلکوں تلے سے کھینچ لی جب نیند کی زمیں
خوابوں کی ہم رکھیں گے کہاں پر اساس پھر

منظر خزاں کے جم سے گئے جنگلوں میں کیوں
کن موسموں میں ہوں گے شجر خوش لباس پھر

جب سے لٹا دلوں سے خزانہ سکون کا
آنکھوں میں بس کے رہ گیا خوف و ہراس پھر

بہتے سمندروں کو صدائیں نہ دے سکی
صحرائے بے زبان کی گونگی تھی پیاس پھر

اک آس تھی بندھی ہوئی گھنٹی سے فون کی
دل تھا کہ واہموں سے ہوا بدحواس پھر

کس سے کرے گا کوئی تقاضائے منصفی
کب ہوگا شہریار کوئی حق شناس پھر

سہلائے گا دلوں کو فقط ہاتھ درد کا
پونچھے گی آنسوؤں کو نئی رت کی آس پھر

کیا کیا نہ اہتمام کیا ہم نے کہکشاں
آیا رتوں کا رنگ ہمیں کیوں نہ راس پھر

●●

دھرتی بھنور بنی ہے سمندر سراب ہے
اے عہدِ بے یقین ہمیں گھر بھی خواب ہے

کچھ تو کریں کہ جاں کا شجر سبز رہ سکے
بے حاصلی کا کرب لہو کا عذاب ہے

اک تیغِ بے نیام ہے سر پر کھنچی ہوئی
یہ وادیٔ اماں ہے کہ شہرِ عتاب ہے

دیکھا ہے اس کی آنکھ میں دریاؤں کا سکوت
طوفان کی لپک تو کہیں زیرِ آب ہے

کس سمت زورِ موج ہمیں ہے اچھالتی
کچھ جوش میں بپھرتی ہوئی جوئے آب ہے

●●

بڑے سلیقے سے شائستگی سے وار کیا
غزالِ شہر کو اس طرح سے شکار کیا

نئے محاورے گھڑ کے شرارزادوں نے
تمام زرّیں مثالوں کو شرمسار کیا

جلے چراغ تو امید روشنی کی تھی
اجالوں نے تو بصارت کو ہی غبار کیا

وہ ایک مہرہ جسے پیادہ جانتے تھے سبھی
اسی کو وقت نے دیکھو کہ شہر یار کیا

وہ جس نے شاخ پہ حرفِ دعا کو سبز کیا
اسے ہی دشت مکینوں نے درکنار کیا

●●

اس کی شکستِ ذات کا ملبہ سمیٹتے
یا رک کے اپنی آنکھ کا دریا سمیٹتے

اک عمر کی ہے بات گھڑی دو گھڑی میں کیا
وقتِ گریز پا ترا قصہ سمیٹتے

گہنا گیا حنائی ہتھیلی کا آفتاب
پلکوں سے آنسوؤں کا صحیفہ سمیٹتے

کاٹی گئی پتنگ کی صورت ہمارے خواب
پھر کیا شبِ دراز کا دھاگا سمیٹتے

کیا درد تھا رگوں میں جو سیّال بن گیا
آنکھوں میں کیسے آگ کا دریا سمیٹتے

●●

کہاسا شہر پہ چھایا ہوا ہے
ہراک منظر دھواں سا ہو گیا ہے

اندھیرے کی ہے فرعونی سیاست
سویرا دیر سے ہونے لگا ہے

امیرِ شہر نے کی سودے بازی
ہماری نسل پر قرضہ چڑھا ہے

تعیّن راستے کا پہلے کر لو
یہ چوراہا بہت سہما ہوا ہے

گریزاں لوگ کیوں ہونے لگے ہیں
حقیقت آئینہ ہی جانتا ہے

سمِ آسیب ہے جس کی زباں کو
لہو کا ذائقہ اچھا لگا ہے

کھنڈر ہو کر بھی ہوں تاریخ تیری
کہ اپنی ذات بھی وکرم شلا ہے

لگی ہے آگ دھرتی پر تبسّم
فلک بھی پیاس کا صحرا ہوا ہے

●●

باباسائیں کی نذر

خموش ہونا قیامت سی دل پہ ڈھائے گا
خبر نہ تھی کہ ترا ہجر یوں رلائے گا

میں شاخ شاخ اسی انتظار میں ٹھہری
وہ خوشبوؤں کا لبادہ پہن کے آئے گا

میں اس کے نقشِ قدم پر چراغ رکھتی ہوں
وہ روشنی کا مسافر پلٹ کے آئے گا

جمال گوتمی مسکان کا کتابوں میں
بھٹکتی سوچ کو اب راستہ دکھائے گا

بجھی ہے مشعلِ الفاظ کہکشاں چپ ہے
کہ اس کا دکھ ہی یہاں مشعلیں جلائے گا

●●

Lahu Rang Sahifa

(Nazmen, Ghazalen)

by

Kahkashan Tabassum

Kasauti Publication

Sadar Bazar, Samastipur-848 101 (Bihar) India

editor@kasautijadeed.com, kasautijadeed@rediffmail.com

www.kasautijadeed.com